نو آبادیاتی عہد میں حالی کی نظم کے فکری رویے

سہیل احمد

ABSTRACT:

One major tool for success in sustaining control over colonies in the hands of colonist is to nullify the local culture and impose the values system of their own. In Colonial India British tried to impose its educational, cultural and social policies for political and economic gains. In the process, Sir Syed Movement at one hand supported the Western power for its modern approaches, but at same time they these policies were analyzed in the shade of religious and indigenous values. Altaf Hussain Haali being one of the most important members of this movement and influential poet of the time, surprisingly advocate both trends at same time. This short paper is study of different aspects of Haali intellectual preferences in support and against of colonial policies and acts in India as they are documented in his poems.

ماہرین ادب و ثقافت نے استعماریت کا تعارف کرتے ہوئے جو دائرہ کار مرتب کیا ہے اس کے تحت استعماریت کو توسیع پسندانہ جذبات اور اپنے ملک کی سرحدوں سے دور سرزمینوں پر تسلط اختیار کرنے کی پالیسی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ تسلط ہوس اور لالچ کی غرض سے دوسرے خطوں کے وسائل پر تصرف حاصل کرنے کے لئے قایم کیا جاتا ہے اور اسے نو آبادیاتی باشندوں کی مرضی کے بغیر عمل میں لایا جاتا ہے۔ استعماریت کے اسباب میں اقتصادی اور معاشی فوائد حاصل کرنا اور اپنی تہذیب، ثقافت، مذہب، علم و ادب کے نظریات کو مسلط کر کے دیر پا حاکمیت کے احساس کو فروغ دینا شامل ہے۔ استعماری اقوام اپنے ان مقاصد کی تکمیل نو آبادیاتی عہد میں کرتی ہیں اور علوم وفنون، تہذیب و ثقافت، اقتصادیات، معاشیات اور سیاسی اثر و نفوذ کے ذریعے اپنی اجارہ داری قایم کرتی

ہیں جسے غلام ملکوں میں آزادی کے بعد بھی قایم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ استعماریت بنیادی طور پر نو آبادیاتی نظام سے تعلق رکھتی ہے استعماری اقوام کسی بھی قوم پر اجارہ داری مختلف طریقوں (سیاسی وسماجی جبر، سیاسی طاقت، اقتصادی اور معاشی اجارہ داری، تہذیبی، ثقافتی، مذہبی، علمی و ادبی برتری) سے قایم کرتی ہیں اور ان کا اطلاق اپنے ابتدائی مرحلے میں نو آبادیاتی عہد میں کیا جاتا ہے۔ نو آبادیات (Colonialism) سمندر پار عمل داریوں سے تعلق رکھنے کا نام ہے۔ ایڈورڈ سعید نے نو آبادیات کو سامراجیت کا نتیجہ قرار دیا ہے اور اس سے مراد دور دراز علاقے پر حکومت کرنا اور بستیاں بسانا لیا ہے۔(۱)

نو آبادیاتی نظام، نو آبادیات کے سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی اور اقتصادی رشتوں کو متاثر کرتا ہے اور ریاست کے مختلف شعبہ جات میں تسلط قایم کرتا ہے۔ نو آبادیاتی نظام کے قیام کا جواز نسلی اور تہذیبی برتری کے نظریے میں تلاش کیا جاتا ہے۔ کمزور اقوام کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنا، انھیں تہذیبی سطح پر اعلیٰ اقدار سے مستفید کرنا اور معاشی ترقی کے اعلیٰ مدارج پر متمکن کرنے کے مقاصد نو آبادیات کی تشکیل میں ظاہر کئے جاتے ہیں لیکن اس کی اصل ماہیت اقتصادی اور معاشی تباہ حالی، محکوم اقوام کی تہذیب و ثقافت کی تحقیر جیسے عناصر سے مرتب ہوتی ہے۔ محکوموں کی زندگی کے تمام شعبوں سیاسیات، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب، تمدن، علم و ادب، کو اپنے نظریات سے بدل کر نئے نظام اقدار کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اس نظامِ اقدار کی اہمیت ثابت کرنے کے لئے محکوم قوم کے نظامِ فکر کی تحقیر و تکذیب کی جاتی ہے۔ اسے جہالت، قدامت اور رجعت کا نمونہ قرار دے کر اپنے نظامِ اقدار کے ذریعے محکوم قوم کے نظامِ فکر کو بدلا جاتا ہے۔ اپنے مخصوص نظامِ اقدار میں ڈھالنے کے لئے نو آبادکار خاص حالات کی ترتیب مقرر کرتا ہے اور ایسا ماحول تخلیق کرتا ہے جو محکوموں کو حاکمانہ نظام کی تقلید پر مجبور کرتا ہے۔ محکوم استعماری طرزِ زندگی کو اپنے لئے معیارِ زندگی بنا کر حاکم کے رنگ میں ڈھلنے کی کوشش کرتا ہے یہ رنگ اپنانے کے باوجود حاکم اور محکوم کے رشتے کی نوعیت تبدیل نہیں ہوتی۔ برابری کی خواہش محض خواب ہی رہتی ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے اس تقلیدی عمل اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کی وضاحت یوں کی ہے:

> ''نو آبادیاتی باشندوں کی دنیا اُن کی اپنی دنیا نہیں ہوتی۔ انھیں اپنی دنیا پر کوئی تصرف اور اختیار نہیں ہوتا نہ اس دنیا کے حقیقی، عملی معاملات پر اور نہ اس دنیا کے تصور اور اس کے نظامِ اقدار پر۔۔۔۔۔۔ نو آبادیاتی باشندے کو نو آبادکار جو تصورِ ذات دیتا ہے وہ اسے بالعموم قبول کرتا ہے اور اس کے مطابق جینا شروع کر دیتا ہے۔۔۔۔۔
>
> فرانز فینن، البرٹ میمی اور ایڈورڈ سعید تینوں اس امر پر متفق ہیں کہ نو آبادیاتی اقوام، نو آبادکار کے دیئے گئے تصور ذات اور کردار کو تسلیم کر لیتی ہیں اور اس کی وجہ سے نو آبادیاتی نظام قایم رہتا ہے۔۔۔۔۔۔ نو آبادیاتی باشندہ نو آبادکار کو اپنے لئے جب ماڈل بناتا ہے تو خود اس جیسا بننے کی تگ وتاز کرتا ہے اور اس تگ وتاز میں خود کو بہت پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ نو آبادیاتی باشندہ، نو آبادکار کا اثبات اور اپنی نفی کرتا ہے۔ اثبات و نفی کے اس

عمل سے گزرتے ہوئے وہ یہ غور نہیں کرتا کہ نہ تو کامل اثبات ممکن ہے نہ نفی، وہ نوآبادکار جیسا اس لئے نہیں بن سکتا کہ وہ اپنی نوآبادیاتی حیثیت سے دست کش نہیں ہو سکتا۔ نوآبادیاتی صورت حال غلام کو آقا کا ہم پلہ بننے کا خواب دیکھنے کی اجازت تو دیتی ہے مگر اس خواب کو پورا کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔'' (۲)

نوآبادیاتی عہد میں استعمار محکومیت کا سلسلہ دراز کرنے کے لئے اپنی تہذیب، ثقافت اور ادبی نظریات کا تسلط قایم کرتا ہے اور اس کی بنیاد اپنی تہذیب و ثقافت کی اہمیت اور محکوم آبادی کی زبان و ثقافت کی تحقیر پر رکھتا ہے۔ اپنی زبان کو اعلیٰ، ناگزیر اور محکوم کی ثقافتی قدروں، ان کی زبان کو غیر حقیقی، مصنوعی اور جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہونے کے باعث رد کرتا ہے۔ محکوم اپنی مادی اور نفسیاتی ضروریات کے ماتحت نوآبادکار کی زبان اور ان کی ثقافت کو اختیار کرتا ہے اور اپنی زبان اور ثقافت کے بارے میں وہی تصورات قایم کرتا ہے جو استعماری قوم نے متعین کئے ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں مشرق شناسی کا شعبہ انہی مقاصد کی ترویج کے لئے قایم کیا گیا تھا جس کا بڑا معنی خیز تجربہ ایڈورڈ سعید نے مشرق شناسی (Orientalism) میں کیا ہے۔ اپنی زبان اور ثقافت سے دوری، حاکم کی زبان اور ثقافت سے قربت غلامی کے دائروں کی توسیع کے ایک پیچیدہ نفسیاتی عمل کو جنم دیتی ہے جس میں اپنی زبان اور ثقافت کی تحقیر اور حاکم کی زبان و ثقافت سے مرعوبیت کا زاویہ ابھرتا ہے جو طویل تر نوآبادیاتی ایجنڈے کی تکمیل کرتا ہے اس طرح نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد بھی نوآبادیاتی اثرات قایم رہتے ہیں۔ لسانی اور ثقافتی استعماریت کے حوالے سے ڈاکٹر ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:

''نوآبادیاتی باشندہ نوآبادکار کی زبان سیکھتا ہے اس کا لباس اختیار کرتا ہے اس کے طرزِ بود و باش کی نقل کرتا ہے نقل و تقلید میں جتنا وہ آگے جاتا ہے اپنی تاریخ، ثقافت اور اپنی اصل سے اتنا ہی دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ اپنی اصل سے دوری اسے طبعی اور نفسیاتی سطح پر ضرر پہنچاتی ہے جسے وہ بہ خوشی قبول کرتا ہے وہ اس ضرر کو محسوس کرتا ہے مگر نوآبادکار جیسے بننے کی خواہش کا زور اس کے احساس پر غالب آجاتا ہے یہ ایک پیچیدہ نفسیاتی عمل ہوتا ہے۔'' (۳)

انگریزوں نے ہندوستان پر اپنی عمل داری قایم کرتے ہوئے سیاسی، سماجی اور اقتصادی سطح پر حاکمیت قایم کرنے کے ساتھ ساتھ علمی، ثقافتی اور ادبی سطح پر بھی اپنے افکار و نظریات کا تسلط قایم کیا۔ لسانی اور ثقافتی استعماریت کی بنیاد محکوم قوم کے مذہب، ثقافت، ادب کی تحقیر اور اپنی زبان و ثقافت کی برتری کے نظریے پر رکھی گئی۔ اس نظریے کے تحت محکوم قوم کے مذہب، ادب و ثقافت کو توہمات، جہالت کا مرکز اور زندگی کی حرارت سے محروم قرار دیا گیا۔ جدید زندگی سے ان کی مطابقت کے متعلق سوالیہ نشان اُٹھایا گیا۔ ان کی تحقیر کر کے اپنی زبان، ثقافت اور ادب کے نظریات کو جدت اور زندگی سے حقیقی ربط کی بنیاد پر ادب، زندگی اور ثقافت کی جڑوں میں اتارنے کی کوشش کی۔ ان نئے نظریات کو ادب و ثقافت کے ماہرین نے ایک عقیدے کے طور پر قبول کیا۔ قبولیت کے اس سلسلے نے ہندوستانی زندگی میں جن نئی جہتوں کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے تعلیمی، معاشرتی، اقتصادی، ثقافتی اور ادبی رشتوں کی نئی کلید پیدا

کی۔ اس نئی استعماری اور نو آبادیاتی پالیسی کو مرتب و مروج کرنے میں ادبا و شعرا نے نمایاں کردار ادا کیا۔ سرسید اور ان کے رفقائے کار نے اس استعماری پالیسی کو عمل میں لانے کے لئے تخلیقی و تنقیدی نمونے پیش کئے۔ انھیں اپنا ادب و ثقافت غیر عملی، فرسودہ، زندگی کی حرارت سے محروم اور مغربی ترقی، مغربی زبانیں اور ثقافت جدید، ترقی یافتہ اور زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ نظر آئی۔ نئے مغربی نظریات سے مرعوب ہونے کے باعث وہ اپنی ثقافت اور ادب کا درست انداز میں تجزیہ بھی پیش نہیں کر سکے۔ اپنے ادب اور ثقافت کے وسیع تر، اعلیٰ علمی اور زندگی سے بھر پور تجربات کا ادراک حاصل نہیں کر سکے۔ مغربی نظریات کو آنکھ بند کر کے قبول کرنے اور پیروی مغرب کا انجام یہ ہوا کہ اثر نفوذ کا یہ سلسلہ تعمیری سے زیادہ تقلیدی صورت اختیار کر گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مغربی نظریات کی قبولیت اپنی تہذیب، ثقافت، ادب کی تحقیر اور گریز کے نظریہ پر قایم کی گئی۔ جس نے مثبت سے زیادہ منفی اثرات مرتب کئے لیکن سرسید کے عہد میں مذہب، تہذیب اور ثقافت کے اثرات نمایاں تھے اور ان شعبوں نے اس عہد کے دانشوروں کی ذہنی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا تھا اس لئے نو آبادیاتی اثرات کے باوجود اپنی تہذیب و ثقافت کے سوتوں سے یہ الگ نہیں ہو پائے۔ ان نو آبادیاتی اثرات کے اثبات کے ساتھ ان کی نفی میں مذہب و تہذیب نے ہمنوائی کی اور اسلام و ماضی کی عظمت نے نو آبادیاتی اثرات کی نفی میں ان کی رہنمائی کی۔ بعد کی نسل (جس کی پرورش مغربی تعلیم اور تہذیب کے اثرات کے تحت ہوئی تھی) کے لئے ان اثرات سے بچنا یا انھیں معتدل کرنا ممکن نہیں تھا۔

حالؔی کی نظم کے نو آبادیاتی مطالعہ میں ان امور کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ انھوں نے مغرب کے نو آبادیاتی نظام کے اثرات قبول بھی کئے اور مذہب اور عظمت رفتہ کے تصور کے تحت انھیں رد کرنے کی کوشش بھی کی۔

حالؔی اس نو آبادیاتی پراجیکٹ سے جس کی بنیاد مشرقی علوم اور زبانوں کی تحقیر اور مغربی علوم اور زبانوں کی برتری پر رکھی گئی تھی متاثر ہوئے۔ بقول سید محمد عقیل:

> ''انھیں بھی انگریز ایک شائستہ قوم مغرب کی ''نظر آنے لگے'' اور ان کے سامنے اپنے اکھڑتے ہوئے خیمے، بکھرتی ہوئی زندگی، منجمد اور ٹھہرا ہوا ادب، سب از کار رفتہ اور مغرب کی تہذیب اور ادب سب کچھ اپنے سے برتر معلوم ہوئے اور پھر پورا مشرق نہ سہی تو کم از کم شعر و ادب ''سنڈاس اور عفونت کا ناپاک دفتر'' محسوس ہونے لگا'' (۴)

سید محمد عقیل نے اپنے مضمون ''مشرقی حالی پر مغرب کا نو آبادیاتی دباؤ'' میں حالی پر جس نو آبادیاتی دباؤ کا تجزیہ کیا ہے وہ مرعوبیت کی صورت میں اجاگر ہوتا ہے ان کی نظمیں اس دباؤ کو پیش کرتی ہیں اس سلسلے میں ان کی نظم ''تعصب اور انصاف'' کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ جیلانی کامران نے اس نظم میں تعصب کی اصطلاح کو مسلمانوں کی طرف اشارہ قرار دیا ہے اور انصاف کے تاریخی اصول کو نئی تہذیب سے وابستہ کیا ہے جیلانی کامران کے مطابق حالی اس تہذیب کو یورپی تہذیب کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ (۵)

حالی اپنی کئی نظموں میں مغرب سے مرعوب نظر آتے ہیں اور اس کے سامنے مشرق کے فلسفے ہیچ دکھائی دیتے ہیں۔ ''فلسفۂ ترقی'' میں کہتے ہیں:

کل کی تحقیقات نظروں سے اتر جاتی ہے آج
بڑھ رہا ہے دم بہ دم یوں آج کل علمِ بشر
قوتِ ایجاد نے اب یاں تلک پکڑا ہے زور
شام کی ایجاد ہو جاتی ہے باسی تا سحر
ساز و ساماں جو نہ تھے کل بادشاہوں کو نصیب
کوڑیوں کے مول بکتے پھرتے ہیں وہ در بدر
کہتے ہیں مغرب سے جب ہوگا برآمد آفتاب
عرصۂ آفاق میں ہوگی قیامت جلوہ گر
دوستو! شاید وہ نازک وقت آپہنچا قریب
آ رہی ہے روشنی مغرب سے اِک اُٹھتی نظر
رو ترقی کی چلی آتی ہے موجیں مارتی
اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیر و زبر
دست کاری کی مٹاتی، صنعتوں کو روندتی
علم و حکمت کی پرانی بستیاں کرتی کھنڈر (۶)

حالؔی نے جو قصیدے انگریز حاکموں اور ان کے حاشیہ برداروں کی شان میں لکھے ان میں استعماری اور نو آبادیاتی نظام کی حمایت کی گئی ہے ان میں انگریز حاکموں کی تہذیب اور معیشت کی ترقی کے لئے کئے گئے اقدامات کو سراہا گیا ہے۔ ان میں نو آبادیاتی ایجنڈے کی تعریف کی گئی ہے اور غلامی کے دور میں کئے گئے اقدامات پر اطمینان کا اظہار کیا گیا ہے:

اے نازشِ برطانیہ، اے فخرِ برنزک
اے ہند کے گلے کی شیاں، ہند کی قیصر
سچ یہ ہے کہ فاتح کوئی تجھ سا نہیں گزرا
محمود، نہ تیمور، نہ دارا، نہ سکندر
تسخیر فقط اگلوں نے عالم کو کیا تھا
اور تو نے کیا ہے دلِ عالم کو مسخر
بند اپنے فرائض میں مسلماں نہ ہندو
معمور مساجد ہیں تو آباد ہیں مندر
امید نہیں ہند کے راحت طلبوں کو
راحت کی کسی سایے میں جز سایۂ قیصر

قیصر کے گھرانے پہ رہے سایۂ یزداں
اور ہند کی نسلوں پہ رہے سایۂ قیصر (۷)
آج کی ایک اک گھڑی سارے برس کا ہے مول
ملک کی مخدومہ کا روزِ ولادت ہے آج
پورا لگاؤ گے جو ہووے گا وہ بارور
مینہ کی طرح ہر طرف بارشِ برکت ہے آج
دولتِ برطانیہ روز فزوں ہو جہو
قوم کو یہ دن نصیب جس کی بدولت ہے آج
قوم کے بدخواہ سب مل کے پڑھیں فاتحہ
نکبت و ادبار کی ملک سے رخصت ہے آج (۸)

مشرقی حالی پر مغرب کے نو آبادیاتی دباؤ کا یہ نتیجہ نکلا کہ اکثر مقامات پر وہ کھل کر مغرب کے نو آبادیاتی نظام کی برائیوں اور ان کے ظلم و جبر کو بیان نہیں کر سکے۔ نظام کے منفی پہلو انھوں نے بڑے محتاط انداز میں اجاگر کئے جہاں کہیں انگریزوں کے ہندوستان پر تسلط کا ذکر آیا۔ اسے قومی نا اتفاقی کا نتیجہ قرار دیا۔مظہر حسین کے خیال میں حالی اتحاد و اتفاق پر زور دیتے تھے اور ان کے نزدیک پھوٹ ہی محکومی کا سبب بنی۔(۹)

''پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ'' میں بھی اتحاد و اتفاق کی کمی کو غیر قوموں کے غلبہ کا بنیادی سبب قرار دیا۔ اور ہندوستان پر حملہ آور ہونے والی مختلف قوموں (غوری، خلجی، لودھی) کا نام لینے کے بعد جب مغربی اقوام کا ذکر کیا تو ساتھ میں ان کے سبب علوم و فنون کے پھیلاؤ کا تذکرہ کر کے احسان مندی کا اظہار بھی کیا گیا۔ حالی کی جن نظموں میں مغربی استعمار کے تسلط کی طرف اشارہ کیا گیا ان میں بھی یہی طریقہ کار اپنایا گیا کہ غیر محسوس انداز میں انگریزی تسلط کا بیان رقم ہوا۔ اس تسلط کی ساری ذمہ داری ہندوستانی قوم کے نفاق اور زوال آمادہ رویوں پر ڈال دی گئی۔ انگریزوں کا ذکر اشارۃً کیا گیا ایک نو آبادیاتی عہد میں اس قسم کے محتاط رویوں کا اظہار ہوسکتا تھا حالؔی نے انگریزوں کی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کا تجزیہ قطعہ ''تدبیر سلطنت'' میں کیا۔ اس قطعہ میں حرفِ حق کی پاداش میں دی جانے والی تعزیروں کا ذکر بھی اشارۃً کیا گیا۔نظم ''قوم کی پاسداری'' میں انگریزوں کی توسیع پسندی کی پالیسی اور لوٹ مار کے رجحان کو قومی جذبات اور ملکی مفاد سے وابستہ کر کے انگریزوں کی تعریف کا پہلو نکالا اور ان کے مقابلے میں ہندوستانی قوم کی وطن سے غداری اور وطن دشمن اقدامات کا ذکر کر کے اپنی قوم کی حیثیت گھٹانے کی کوشش کی:

اور قوموں سے انہی لوگوں کو ہے یہ امتیاز
حملہ جب کرتے ہیں یہ، کرتے ہیں اپنی فوج پر

ہوگا خوف ایسا نہ دشمن سے کسی دشمن کو بھی
جس قدر ہے ان سے اپنوں اور یگانوں کو خطر (۱۰)

''فلسفۂ ترقی'' میں انگریزوں کی ترقی، ان کی وطن سے محبت اور حبِ وطن کی خاطر توسیع پسندانہ عزائم اختیار کرنے کا ذکر موجود ہے جو مغربی اقوام سے مرعوب ہونے کا اظہار ہے۔ حالؔی نے استعمار کے تسلط، ان کے توسیع پسندانہ عزائم کی بحث اگر چھیڑی بھی ہے تو اس قدر احتیاط سے کہ اس سے مذمت کا واضح اظہار نہیں ہوتا۔ حالی کی شاعری کا ایک بڑا حصہ وہ ہے جس میں مغربی برتری کا احساس اور مشرقی زبان اور ثقافت کی نسبت مغربی زبانوں اور ان کے علمی و ادبی نظریات کی بڑائی کا اعتراف کیا گیا ہے۔ جن کی مثالیں ان کی قومی نظموں خاص کر مسدس مد و جزر اسلام میں بھی ملتی ہیں۔

اس نو آبادیاتی دباؤ سے نجات کی صورت یا کم از کم اسے کم کرنے یا معتدل بنانے کا جواز انھوں نے تاریخ کے نظریۂ ارتقا میں تلاش کیا ہے مذہب، اسلامی تاریخ کے مطالعہ اور مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی یاداشت سے انھیں یہ اطمینان ہوا ہے کہ ترقی وارتقاء کی قدریں کسی ایک قوم کی میراث نہیں۔ زمانے اور حالات کے تحت ان کی ترتیب، مقام اور صورت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اپنی تہذیب اور ثقافت کی انتہائی مذمت کے باوجود وہ چند عظمتوں پر یقین رکھتے ہیں جن کا تعلق مذہب ،اس کی روحانی اور اخلاقی اقدار کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور اسی اخلاقی اور روحانی بصیرت کی روشنی میں حالی نے اپنی بعض نظموں میں انگریزوں کے نظامِ اقدار پر اعتراضات اُٹھائے ہیں۔ ''آزادی کی قدر''، انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی''، گورے اور کالے کی صحت کا میڈیکل امتحان'' میں آزادی کی قدر و قیمت بیان کرتے ہوئے غلامی اور انگریزوں کے نسلی امتیاز کی مذمت کی ہے۔ ''گورے اور کالے کی صحت کا میڈیکل امتحان'' میں نو آبادیاتی دور کے حاکموں کی نفسیات اور احساسِ برتری کو طنزیہ پیرایہ میں بیاں کیا ہے:

دو ملازم، ایک کالا اور گورا دوسرا
دوسرا پیدل، مگر پہلا سوارِ راہوار
تھے سول سرجن کی کوٹھی کی طرف دونوں رواں
کیونکہ بیماری کی رخصت کے تھے دونوں خواستگار
راہ میں دونوں کے باہم ہو گئی کچھ ہشت مشت
کوکھ میں کالے کی اک مکا دیا گورے نے مار
صدمہ پہنچا جس سے تلی کو بہت مسکین کی
آ کے گھوڑے سے لیا سائیس نے اس کو اُتار
ٹھوک کر کالے کو گورے نے تو اپنی راہ لی
چوٹ کے صدمے سے غش کالے کو آیا چند بار

آخرش کوٹھی پہ پہنچے جا کے دونوں پیش و پس
ضارب اپنے پاؤں اور مضروب ڈولی میں سوار
ڈاکٹر نے آ کے دونوں کی سنی جب سرگزشت
تہہ کو جا پہنچا سخن کی سن کے قصہ ایک بار
دی سند گورے کو لکھ تھی جس میں تصدیقِ مرض
اور یہ لکھا کہ سائل ہے بہت زار و نزار
یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مکے سے مرے
کر نہیں سکتا حکومتِ ہند پر وہ زینہار
اور کہا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند
کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جان دار
ایک کالا پٹ کے جو گورے سے فوراً مر نہ جائے
آئے بابا اس کی بیماری کا کیونکر اعتبار (۱۱)

جیلانی کامران کے مطابق حالی نے اپنی بعض نظموں میں یورپی تہذیب کو انسانی برتری کے معیار کے طور پر دیکھا ہے لیکن نظم ''کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان'' اس تہذیبی برتری کو سبوتاژ کرتی ہے اس نظم کے ساتھ ایک نئی دنیا ابھرتی ہے یہ دنیا یورپ کی مہذب دنیا نہیں ہے بلکہ نو آبادیاتی نظام کی دنیا ہے جہاں انسان کو رنگ، نسل اور قوم کے ذریعے پہچانا جاتا ہے جہاں رنگ دار قوم کو محکوم اور سفید فام قوم کو حاکمیت کا درجہ دیا جاتا ہے جیلانی کامران کے الفاظ میں:

> ''حالؔی کی یہ نظم اقتدار کو سفید فام قوم کے ساتھ منسوب کرتی ہے اور اس طرح یورپی تہذیبی برتری کا تاثر نو آبادیاتی نظام میں بدل کر وہ دل آویزی کھو دیتا ہے جو حالی کی دوسری نظموں میں دکھائی دیتی ہے۔'' (۱۲)

ڈاکٹر نجیب جمال نے'' کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان'' کو انگریزوں کی امتیازی پالیسی پر نکتہ چینی سے تعبیر کیا ہے جس میں طنزیہ انداز واضح اور براہِ راست ہے۔ (۱۳)

حالی نو آبادیاتی دور میں ترقی کے وسائل کام میں لاتے ہوئے قوم کو ترقی کی طرف جانے کا مشورہ دیتے ہیں مگر مغربی تعلیم اور تہذیب کی منفی اقدار قبول کرنے کی حمایت نہیں کرتے بلکہ برطانوی پالیسی کی ان جہتوں کی مخالفت کرتے ہیں جو مسلمانوں کے لئے ضرر رساں ہیں۔ حالی نے نئی کاروباری زندگی اور اس کے مسائل کا تجزیہ نظم ''ننگِ خدمت'' میں پیش کیا۔ اس نظم میں گلوبل ویلیج (ثقافتی گاؤں) کے مسائل بیان کرتے ہوئے انگریزوں کے تسلط سے پہلے کے دور کو سکون اور آسودگی کا دور قرار دیا ہے نئی زندگی میں نوکری کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے انسان میں نسلی امتیاز کے رویے آزادی و غلامی کے تصورات پیش کئے۔ نسلی امتیاز اور غلامی کو انسانیت کی توہین اور

آزادی کو نعمت قرار دیا:

اس سے بڑھ کر نہیں ذلت کی کوئی شان یہاں
کہ ہو ہم جنس کی ہم جنس کے قبضے میں عناں
ایک گلے میں کوئی بھیڑ ہو اور کوئی شباں
نسلِ آدم میں کوئی ڈھور ہو کوئی انساں
ناتواں ٹھہرے کوئی، کوئی تنومند بنے
ایک نوکر بنے اور ایک خداوند بنے (۱۴)

حالی ''ننگِ خدمت'' میں انگریزوں کی تقلید، ان سے مدد طلب کرنے کے بجائے اپنی مدد آپ کا جذبہ پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ڈاکٹر رفیق زکریا کے مطابق حالی نے اس نظم میں انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں کے رنگ وڈھنگ اور سرگرمیوں کی مذمت کی ہے۔ (۱۵)

حالی نے انگریزوں کے ملک کی ترقی کے لئے کئے گئے اقدامات کی حمایت کے ساتھ برطانوی حکومت کی بعض پالیسیوں پر تنقید بھی کی ہے حکومت کی معاشی لوٹ کسوٹ کو بھی ہدفِ مذمت بنایا۔ انھیں علم تھا کہ معاشی بنیادوں پر قوم کا استحصال کیا جا رہا ہے اور مسلمانوں کو معاشی بدحالی کا شکار بنا کر اپنے مذہب کی طرف راغب کیا جا رہا ہے انھوں نے حکومت کے قایم کردہ ان اداروں پر نکتہ چینی کی ہے جو عیسائیت کی تبلیغ میں مصروفِ کار ہیں اور مسلمانوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے غریب اور یتیم بھائیوں کی مدد کریں تا کہ مفلسی کو بنیاد بنا کر انھیں مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہ کیا جا سکے۔ نظم ''ترغیب امدادِ یتیماں'' میں انگریزی اسکولوں کی اس پالیسی سے خبردار کیا ہے جس کے تحت غریب مسلمان بچوں کو عیسائیت اختیار کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے اور اس خطرہ سے محفوظ رکھنے کے لئے یتیموں کی مالی امداد کی اپیل کی ہے:

یہ قوم کے بچے، جو پڑے پھرتے ہیں بے کس
یہ پود ہے میری اسے دیکھو، نہ گنواؤ
دیکھو نہ حقارت سے پھٹے کپڑوں کو ان کے
ان گدڑوں میں جو لعل کہ گم ہیں انھیں پاؤ
پھرتے ہیں بہت گھات میں یاں ان کے شکاری
ان پنچھیوں کو موت کے چنگل سے بچاؤ
امت کے یتیموں کو ہو انجیل کی تعلیم
اور اپنی تم اولاد کو قرآن پڑھاؤ
تثلیث کی پاتے ہوئے دیکھ انھیں تلقین
اور اپنے جگر گوشوں کو توحید سکھاؤ

گرجا میں حریف ان کو سکھائیں مری توہین
اور کان نہ توہین پہ تم میری ہلاؤ
جن بچوں کو بیٹوں کی طرح چاہیے رکھنا
ہاتھ آئیں تمہارے تو غلام اُن کو بناؤ
کھانے کی بھی ، کپڑے کی بھی لیں ان کی خبر غیر
اور تم نہ کبھی بھول کے آنکھ ان سے ملاؤ (۱۶)

انگریزوں نے نوآبادیاتی عہد میں قوم کی ذہنی حالت بدلنے کے لئے جو پالیسی اختیار کی تھی ،مشرقی افراد کو جاہل ،کم ذہن اور نا اہل قرار دیتی ہے اوراس کے مقابلے میں مغربی ذہن کی بلندی اور ان کی علمی برتری ثابت کرتی ہے اسے حالی نے مذہب اور تہذیب کی عظمت ثابت کرکے زائل کرنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کو ترقی کے اعلیٰ مدارج تک لے جانے کے لئے حالی نے جو لائحہ عمل تیار کیا اس میں جدید مثبت قدروں کو اپنانے اورمنفی قدروں کی تکذیب کا مشورہ دیا گیا ہے یہ لائحہ عمل دوہری معنویت لئے ہوئے تھا۔ ایک طرف زندگی کے جدید تقاضوں کی حمایت کرکے مسلمانوں کو بحیثیت ایک قوم مضبوط اور مستحکم بنانا ، ان کی اصلاح کرنا دوسری طرف انگریزوں اور ہندوؤں کے اس گٹھ جوڑ کو سمجھنا جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ کی حیثیت رکھتا تھا۔ حالی کی شاعری کا مطالعہ ان دونوں صورتوں کو واضح کرتا ہے یہ اجزاء مسدس مدو جزر اسلام اور شکوۂ ہند میں اپنی پوری معنویت کے ساتھ موجود ہیں۔ ان نظموں میں بنیادی سوال مسلم قوم کی ترقی اور ان کی جداگانہ شناخت مقرر کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔

حالی نے مسدس میں مسلمانوں کو ان کا شاندار ماضی یاد دلاتے ہوئے انھیں ایک عظیم قوم کا درجہ دیا ہے جس نے پوری دنیا کے سامنے اخلاق، تہذیب اورعلم و ہنر کے معیارات تشکیل دیے۔ مسلمانوں کی مختلف علوم وفنون خاص کر سائنسی علوم میں ترقی کا ذکر ایک خاص مقصد کے تحت کیا گیا ہے جس زمانے میں یہ نظم لکھی گئی وہ جدید سائنسی ایجادات اور نئے سائنسی علوم کی ترقی کا دور تھا۔ سائنس اورٹیکنالوجی کے میدان میں کی گئی ترقی اور جدید سائنسی ایجادات نے انگریزوں کو ایک عظیم قوم کا درجہ دیا تھا۔ حالؔی نے جدید دور کی سائنسی ترقی کی بنیاد مسلمانوں کی سائنس اورٹیکنالوجی کے باب میں کی گئی ترقی پر رکھی وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مغربی اقوام نے یہ علوم وفنون مسلمانوں سے سیکھے۔ مغرب میں ان علوم کی ترقی مسلمانوں کی مرہونِ منت ہے۔ حالؔی نے مسلمانوں کے عروج کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے اس دور میں مغربی اقوام کی پستی اور جہالت کا تجزیہ کیا ہے اور یہ حقیقت واضح کی ہے کہ جس زمانے میں مسلمان علمی ترقی کے معراج پر تھے یورپ جہالت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا:

ترقی کا جس دم خیال اُن کو آیا
اک اندھیر تھا ربعِ مسکوں میں چھایا
ہر اک قوم پر تھا تنزل کا سایہ
بلندی سے تھا جس نے سب کو گرایا

وہ نیشن جو ہیں آج گردوں کے تارے
دھندلکے میں پستی کے پنہاں تھے سارے
وہ قومیں جو ہیں آج غم خوارِ انساں
درندوں کی اور ان کی طینت تھی یکساں
جہاں عدل کے آج جاری ہیں فرماں
بہت دور پہنچا تھا واں ظلم و طغیاں
بنے آج جو گلہ باں ہیں ہمارے
وہ تھے بھیڑیئے آدمی خوار سارے (۱۷)

حالیؔ نے مغربی اقوام کی پستی اور جہالت کا ذکر کرتے ہوئے اس دور میں انگریزوں کا حال بھی لکھا ہے جن میں درندوں جیسی صفات، وحشت اور بربریت موجود تھی۔ انھیں حالیؔ نے آدم خور بھیڑیئے کہا ہے۔

حالیؔ نے مسدس میں مسلمانوں کو ان کا ماضی یاد دلا کر اپنی شناخت قایم کرتے ہوئے ترقی کے وسائل کام میں لانے کا مشورہ دیا ہے مگر ترقی کا یہ لائحۂ عمل اسلامی تشخص کی قربانی کے نتیجے میں نہیں بلکہ مذہبی شناخت اور قومی تشخص کی بحالی کے ساتھ اختیار کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ جدید سائنسی ترقی اور جدید وسائل کو کام میں لانے کے لئے حالی جو جواز فراہم کرتے ہیں وہ جواز اسلامی تعلیمات سے حاصل کرتے ہیں:

ہر اک میکدے سے بھرا جا کے ساغر
ہر اک گھاٹ سے آئے سیراب ہو کر
گرے مثلِ پروانہ ہر روشنی پر
گرہ میں لیا باندھ حکمِ پیمبر

کہ ''حکمت کو اک گم شدہ لال سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اُسے مال سمجھو (۱۸)

اس بند میں علم کے حصول کے لئے اسلامی تعلیمات سے جو سند حاصل کی گئی ہے اس کے بارے میں ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''مسدس کا شاعر جب اپنی خودی میں ڈوب کر ابھرا تو یہ حقیقت اس پر منکشف ہو چکی تھی کہ قوم کی اصلاح و ترقی کے لئے مغرب کی اندھی تقلید درکار نہیں اسلام کی ابدی تعلیمات اور تہذیبی اقدار ماضی کی طرح آج بھی ہماری ملی بقا و ارتقا کی ضامن ہیں۔''(۱۹)

مسدسِ حالی میں اسلامی تاریخ کے نقوش تازہ کر کے ایک ایسے دور میں مسلمانوں میں تاریخی و مذہبی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی گئی جو استعماری اور نو آبادیاتی رجحانات کے تحت ان عناصر کی تکذیب پر آمادہ تھا۔ جیلانی

کامران کے مطابق مسدسِ حالی اسلامی تہذیب کی بازیافت کی ایک کوشش ہے جو بلادِ اسلامیہ کے خاتمے اور دارالحرب کے پیدا ہونے کی صورت میں المیے سے دوچار رہے۔ اس دور میں دارالحرب کو درالاسلام میں بدلنے کا واحد راستہ اسلام کے تہذیبی تصور کے احیا میں پوشیدہ تھا۔ حالی نے مسلمانوں کے تہذیبی تصور کو ہمہ گیر بنانے کے لئے جو اساس قایم کی وہ مسدس میں ایک اشارے کے طور پر موجود ہے۔ (۲۰) ڈاکٹر شوکت سبزواری کے مطابق حالی نے مسدس کے توسط سے عظمتِ رفتہ کا احساس پیدا کیا۔ خوابیدہ قومی شعور کو بیدار کیا۔ مسلمان جو ماضی سے کٹ کر تہذیبِ مغرب کی طرف بڑھ رہے تھے ان کا رشتہ ماضی سے استوار کیا۔ (۲۱)

مسدس حاؔلی میں مسلمانوں کو ایک الگ قوم کی حیثیت دینے اور ان کی الگ شناخت مقرر کرنے کا عمل مخصوص جغرافیائی حدود کے اندر اختیار کیا گیا لیکن ''شکوۂ ہند'' میں مسلمانوں کو واضح طور پر ایک الگ قوم تصور کر کے علیحدگی پسندی کا نظریہ پیش کیا گیا جس کے پس منظر میں انگریزوں اور ہندوؤں کی مسلمانوں کے مفادات کے خلاف ملی جلی کوششیں، ان کی اسلام دشمنی اور متعصّبانہ تصورات صاف دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے ''شکوۂ ہند'' میں مسلم قومیت کے جداگانہ تصور کو ہندوں اور انگریزوں کی اسلام دشمنی کا نتیجہ قرار دیا ہے اور اس کے پس منظر میں کانگرس کے متحدہ قومیت کے نظریئے ، ہندو کی تنگ نظری اور تعصب ، اردو ہندی تنازعہ اور انیسویں صدی میں پراچین ہندو تہذیب کی احیائی تحریکوں کا کردار واضح کیا ہے جو اس نظم میں ردعمل کے جذبات ابھارنے میں ممد معاون ثابت ہوئیں۔ (۲۲)۔ سید وقار عظیم نے شکوۂ ہند میں مسلم وحدت اور ہندوستان سے علیحدگی کے تصور کو اس دور کی آریہ سماج تحریک، ہندو قومیت کے احیا کی مختلف تحریکوں اور کانگرس کے نظریات کا ردعمل قرار دیا ہے (۲۳)۔ حالی نے ''شکوۂ ہند'' میں جداگانہ قومیت کا تصور پیش کرتے ہوئے جس علیحدگی پسندی کی بنیاد رکھی وہ اس وقت کے اسلام دشمن رجحانات کا ردعمل تھی جس نے حالی جیسے صلح جو، ہندوستانی اتحاد کے حامی شخص کو بھی علیحدگی پسند رجحانات کا قائل بنا دیا۔ انھوں نے جذباتی طور پر ہندوستان سے رخصت کا اعلان کیا اسلام کی موجودہ حالت کا ذمہ دار ہندوستان، یہاں کی آب و ہوا اور ہندوستان کے افراد کے رویوں کو ٹھہرایا۔ حالی کا یہ ''شکوہ ہند'' ہندوستان میں بسنے والی اقوام سے مایوسی کا اظہار ہے:

رخصت اے ہندوستاں، اے بوستانِ بے خزاں
رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی مہماں
آج گو شکوؤں سے ہیں لبریز ہم اے خاکِ ہند
ہیں مگر اِحسان اگلے تیرے سب خاطر نشاں
تھی ہماری قوت و ملت، رسم و عادت سب جدا
رشتہ وپیوند کوئی ہم میں اور تجھ میں نہ تھا
تو نے ثروت دی ، حکومت دی، ریاست دی ہمیں
شکر کس کس مہربانی کا کریں تیری ادا

نبھ سکیں لیکن نہ آخر تک یہ خاطر داریاں
جو دیا تھا تو نے وہ آخر کو سب رکھوالیا
بھول جائیں گے کہ تھے کن ڈالیوں کے ہم ثمر
ٹوٹ کر آئے کہاں سے اور بکے جا کر کہاں
پر زمانے میں رہیں گے تا قیامت یادگار
جو کیے برتاؤ تو نے ہم سے اے ہندوستاں
ماجرا ہوگا ہمارا عبرت اوروں کے لئے
چیت جائیں گے بہت سن کر ہماری داستاں
برکتیں یاں چھوڑ کر ہم اپنی جائیں گے بہت
ہم نہ ہوں گے پر نصیحت ہم سے پائیں گے بہت (۲۴)

حالی کی نظم انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں کی نوآبادیاتی صورت حال اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کا احاطہ کرتی ہے۔ نوآبادکار اپنی حاکمیت قایم کرنے کے لئے کس قسم کا نظام ترتیب دیتا ہے اور اس کے اثرات محکوموں کے ذہن پر کس طرح مرتب ہوتے ہیں اس کی عکاسی حالی کی نظم کے ایک وسیع حصے میں ہوئی ہے اس حصے میں وہ مرعوبیت اور شدید قسم کے دباؤ کا شکار نظر آتے ہیں اور کھل کر مغربی نظام کی خامیوں کا احاطہ نہیں کر پاتے۔ لیکن حالؔی کی ذہنی تشکیل میں چونکہ ماضی، قدیم روایات، تہذیب اور مذہب نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ مذہب اور تہذیبی اقدار سے گہرے تعلق نے انھیں اس نوآبادیاتی خوف اور مرعوبیت سے ایک حد تک باہر نکال کر ایک الگ فضا میں سانس لینے کا موقع بھی فراہم کیا۔ جو مذہب، اعلیٰ تہذیبی اقدار اور عظمتِ رفتہ کی فضا تھی۔ نوآبادیاتی عہد میں انگریز استعمار کی طرف سے مذہب اور اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے کی جو کوششیں جاری تھیں حالی نے اس کا حل اسلامی تشخص کی بحالی اور اسلامی تاریخ کی حقیقی انداز میں تشکیلِ نو میں تلاش کیا تھا۔ اس لحاظ سے حالی کے ذہن پر پڑنے والا نوآبادیاتی دباؤ اور اس سے باہر نکل کر ایک نئی فضا میں داخل ہو کر اسلامی عقائد اور اسلامی تاریخ کے اصل سوتوں کی بازیافت یہ وہ بنیادی رویے ہیں جو نوآبادیاتی اثرات کے تحت وجود میں آئے۔ ان دونوں رویوں کا مطالعہ حالی کی شاعری پر نوآبادیاتی نظام کے اثرات کے ضمن میں کیا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات:

(۱) ایڈورڈ سعید، ثقافت اور سامراج (مترجم یاسر جواد) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد طبع اول ۲۰۰۹ء، ص ۲۳-۲۲
(۲) ڈاکٹر ناصر عباس نیر، نوآبادیاتی صورتحال، مشمولہ سہ ماہی، ادب باز، دہلی، ۱۸۵۷ء جلد ۲، شمارہ ۵، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۷ء، ص ۵۲-۵۰

(۳) ایضاً،ص۵۲
(۴) سید محمد عقیل، مشرقی حالی پر مغرب کا نوآبادیاتی دباؤ،مشمولہ الطاف حسین حالی، ''تحقیقی و تنقیدی جائزے''،مرتب پروفیسر نذیر احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ ،نئی دہلی ۲۰۰۲ء،ص ۸۷۔۱۷۷
(۵) جیلانی کامران،''حالی کی غیرمعروف نظمیں''،مشمولہ صحیفہ حالی نمبر شمارہ ۵۸ جنوری ۱۹۷۲ء،ص ۸۸۔۸۷
(۶) کلیاتِ نظمِ حالی ،جلد دوم،مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی،مجلس ترقی ادب لاہور،س۔ن،ص۲۷۔۲۷۱
(۷) کلیاتِ نظم حالی، جلد اول ،مرتبہ ڈاکٹرافتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اول جولائی ۱۹۶۸ء، ص۲۷۔۲۷۱
(۸) ایضاً،ص۹۱-۲۹۰
(۹) مظہر حسین، علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ،انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی ،۱۹۹۳ء،ص۲۴۲
(۱۰) الطاف حسین حالی، کلیاتِ نظمِ حالی ،جلد اول،ص۱۸۴
(۱۱) ایضاً،ص۸۲۔۱۸۱
(۱۲) جیلانی کامران، حالی کی غیر معروف نظمیں ،ص۹۰
(۱۳) ڈاکٹر نجیب جمال،''قومی شعور ،اردو شاعری اور اقبال''،مشمولہ ادب اور قومی شعور،مرتبہ ڈاکٹر یوسف خشک، اکتوبر ۲۰۱۰ء ص۲۶۳
(۱۴) الطاف حسین حالؔی، کلیاتِ نظمِ حالی ،جلد دوم ،ص۲۱۲
(۱۵) ڈاکٹر رفیق ذکریا، ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج،مترجم ڈاکٹر ثاقب انور، ترقی اردو، بیورو نئی دہلی ۱۹۸۵ء،ص ۴۴۱
(۱۶) الطاف حسین حالؔی، کلیاتِ نظم حالی ،جلد دوم،ص ۸۹۔۲۸۷
(۱۷) ایضاً،ص ۷۷۔۷۵
(۱۸) ایضاً،ص ۷۹۔۷۸
(۱۹) ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مقدمہ کلیاتِ نظمِ حالی ،جلد اول،ص۶۲
(۲۰) جیلانی کامران، تنقید کا نیا پس منظر ،مکتبہ جدید ادب ،لاہور،۱۹۶۴ء،ص ۹۶۔۹۴
(۲۱) ڈاکٹر شوکت سبزواری، نئی پرانی قدریں ، مکتبہ اسلوب کراچی ، اشاعتِ اول ۱۹۶۱ء،ص۱۳۴
(۲۲) ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار،''ملی نشاۃ الثانیہ کا نقیب حالی''،مشمولہ صحیفہ حالی نمبر، شمارہ ۵۸، جنوری ۱۹۷۲ء،ص۶۴-۶۳
(۲۳) سید وقار عظیم،''حالی کا شکوۂ ہند''،مشمولہ صحیفہ حالی نمبر ،جنوری ۱۹۷۲ء،ص ۱۲۴
(۲۴) الطاف حسین حالؔی، کلیاتِ نظمِ حالیؔ،جلد دوم،ص ۹۶۔۱۹۵،۱۸۴،۱۸۲